جناب ایس۔ اے رحمٰن

قائدِ اعظم اور دو قومی حقیقت

"دو قومیں اُس وقت سے وجود میں آگئیں جب سرزمینِ ہند پر پہلے مسلمان نے قدم رکھا۔" قائدِ اعظم کے اس قول کا مفہوم برصغیر پاک و ہند کے تاریخی پس منظر میں سمجھا جاسکتا ہے۔

ہندوستان کے شمال مغربی پہاڑی دروں سے وقتاً فوقتاً فاتحین کی یلغاریں ہوتی رہیں۔ ویدک دھرم کے آریائی نام لیوا انہی نو واردوں میں سے تھے۔ اُن سے کئی صدیاں بعد مسلمان آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ مقامی نومسلموں نے ان کی تعداد میں اضافہ کیا۔ یہ اکثر و بیشتر ان قدسی صفات بزرگوں کے وعظ و تلقین کا نتیجہ تھا، جو بغیر کسی حکومتی سرپرستی کے ہندوستان میں تشریف لاکر اپنے حلقہ ہائے ارشاد قائم کرتے رہے۔ ہندو معاشرہ جو انھوں نے یہاں موجود پایا، ایک اختصاصی دائرہ تھا جس میں بیرونی عناصر کے لیے گنجائش ہندو کی عائد کردہ شرائط ہی پر نکل سکتی تھی۔ ہندو کے لیے ہر غیر ہندو ملیچھ اور ناپاک تھا جس سے مَس اس کے دھرم کو بھرشٹ کرنے کے لیے کافی تھا۔ ہندو سماج ذات پات کے بندھنوں میں جکڑا ہوا تھا اور جمہوریت و مساوات کے تصوّر سے ناآشنا۔ دیوتاؤں اور دیویوں کی پوجا اس کا شعار تھا۔ اس کے برعکس مسلمان کا نظامِ فکر و عمل، توحیدِ خداوندی، مساواتِ انسانی اور غیر اللہ کی پرستش سے بیزاری کی اساس پر قائم تھا۔ ان دونوں میں نظریاتی اور عملی سطح پر نہ اختلاط ممکن تھا اور نہ اپنی انفرادیت کھوئے بغیر یہ ایک دوسرے میں جذب ہو سکتے تھے۔

مسلمان ہندوستان کے بیشتر رقبے پر ایک ہزار سال کے قریب حکمران رہے جب تک مسلمانوں کی جمعیت توانا رہی، ہندو دبا رہا لیکن مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہوا تو ہندوؤں اور سکھوں کا ردِ عمل ملک کے ہر گوشہ سے سرکشی کی صورت میں ظاہر ہوا۔

طوائف الملوکی اور افراتفری کی کیفیت سے فائدہ اٹھا کر، انگریز جو برصغیر میں تجارت کے لیے آئے تھے سیاسی میدان میں سرایت کرتے گئے اور آہستہ آہستہ ہندوستان کو برطانیہ کی نوآبادی بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

مسلمان اقتدار سے محروم ہو کر راندۂ درگاہ اور ہر لحاظ سے پس ماندہ ہو گئے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ہندو، انگریز حاکم کا محبوب اور مسلمان زیادہ سے زیادہ معتوب ہوتا گیا۔ ہندو تعلیم، تجارت، صنعت، سرکاری ملازمت وغیرہ ہر شعبہ میں سبقت لے گئے اور انگریزی اقتدار کے سائے تلے پروان چڑھتے رہے۔ زیادہ وقت نہ گزرا کہ کل کے حاکم، عملی طور پر ہندو کے محکوم نظر آنے لگے۔ رفتہ رفتہ ہندو لیڈروں نے ہندی قومیت کا مفروضہ وضع کر لیا اور وہ انگریز کو نکال کر رام راج کے قیام کا خواب دیکھنے لگے۔

ہزار سالہ غلامی کے نتیجہ میں، ہندو کے شعور و لاشعور میں مسلمانوں کے خلاف نفرت رچ بس چکی تھی۔ اس نفرت کا پہلا مظاہرہ ۱۸۶۹ء میں ہندو کی لسانی عصبیت کی صورت میں ابھرا۔ بنارس کے ہندوؤں نے اردو کی بجائے ہندی کو سرکاری زبان کا درجہ دلانے اور فارسی سم الخط کی جگہ دیوناگری رائج کرنے کی تحریک جاری کی۔ اس تحریک نے سرسید احمد خاں جیسی صلح کل شخصیت کو بھی ہلا دیا اور ان کو اس پیش گوئی پر مجبور کیا کہ اس کے بعد ہندو اور مسلمان ایک متحدہ قوم کی طرح کسی معاملہ میں بھی مل کر کام نہ کر سکیں گے بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں، اُن کے مابین مخالفت و عناد کی خلیج وسیع تر ہوتی جائے گی۔ یہ اُن کی پیش گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی۔

۱۸۸۲ء میں بنگالی ادیب بنکم چندر چٹرجی کا ناول "آنند مٹھ" شائع ہوا۔ اسے ادبی سطح پر مسلمانوں کے خلاف ہندو کا منشورِ نفرت سمجھنا چاہیے۔ اس تصنیف پر خون آشام کالی دیوی کا سایہ تھا۔ "بندے ماترم" جسے کانگریس نے بعد میں قومی ترانہ بنا لیا، اسی رسوائے زمانہ ناول کا حصہ تھا۔

عصرِ حاضر کے ایک بنگالی ادیب، نیرد چوہدری نے اپنی کتاب AUTOBIOGRAPHY OF AN UNKNOWN INDIA میں ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف

سنگینی ہوتی منافرت کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے :

"ابھی ہم لکھ پڑھ بھی نہ سکتے تھے کہ ہمارے ذہنوں میں یہ بات بٹھائی گئی کہ مسلمانوں نے ہندوؤں پر حکومت کی، اُن پر ظلم کیے، اور اپنا مذہب ایک ہاتھ میں قرآن اور ایک میں تلوار لے کر پھیلایا۔ ان کے حکمرانوں نے ہماری عورتیں اغوا کیں، ہمارے مندر برباد کیے اور ہمارے پوتر استھانوں کو ناپاک کر دیا۔"

اس طرح کے بے سرو پا قصوں سے ہندو بچوں کو مسلمان دشمنی میں راسخ کیا جاتا تھا۔ پھر یہ ادیب اپنی طالب علمی کے دور سے متعلق تعلیمی بٹوارے کا ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتا ہے۔ اس کے بقول ہندو لڑکے مسلمان لڑکوں کے ساتھ بیٹھنے سے انکار کرتے تھے کیونکہ ان سے پیاز کی بو آتی تھی۔ لہٰذا ہر جماعت کے دو سیکشن بنائے جاتے تھے تاکہ ہندو اور مسلمان طلبا الگ الگ تعلیم حاصل کریں۔

ایک اور ہندو فاضل کے ایم پانیکر نے اپنی کتاب "A SURVEY OF INDIAN HISTORY" میں برصغیر میں مسلمانوں کے ورود کے اثرات کا ان الفاظ میں تجزیہ کیا ہے :

"دسویں صدی عیسوی سے قبل ہندو سماج میں تقسیمی خطوط اُفقی تھے۔ بدھ مت، جین مت، میں سے کوئی مذہب بھی ان تفریقات پر اثر انداز نہ ہوا۔ یہ ناقابلِ جذب عناصر تھے اور آسانی سے موجودہ تقسیمی ڈھانچے میں کھپ گئے۔ اس کے برعکس اسلام نے ہندوستانی معاشرہ کو ازسرتاپا عمودی تقسیم سے دو حصوں میں بانٹ دیا اور اس طرح آج کل کی اصطلاح کے مطابق، دو الگ الگ قومیں شروع ہی سے وجود میں آگئیں۔ ان کے درمیان ہر سطح پر اختلاف تھا اور ان کے مابین کسی قسم کا سماجی رابطہ یا اختلاط نہ ہونے کے برابر تھا۔"

اسی مصنف نے ۱۹۳۷ء میں مجلہ CONTEMPORARY REIEW میں اپنے ایک مضمون میں صراحت کی کہ "ہندوؤں نے ہندوستان کو مخصوص معنی میں اپنا دیس سمجھنا شروع کر دیا تھا اور ان کی نظر میں تمام مسلمان پردیسی تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ایک ہندو، اسلام قبول کرنے کے بعد، ہندوستانی نہیں رہتا۔"

اس نفسیاتی گتھی کو سلجھانے کے لیے ہندو ذہن کو دو ترکیبیں سوجھیں۔ ان کے گرم مزاجوں

نے تو تمام مسلمانوں کو ختم کر دینے یا بصورتِ دیگر انھیں ملک بدر کر دینے ہی میں ہندو جاتی کی نجات سمجھی۔ ان کے زیادہ ہوشمند طبقے نے مسلمانوں کو ہندو بنا لینے کی سوچی۔ چنانچہ ہندو مورخ آر۔ سی موجمدار "HISTORY OF THE FREEDOM MOVEMENT" میں لکھتا ہے کہ نوجوان آریہ سماجی برملا اعلان کرتے تھے کہ وہ اس دن کے انتظار میں ہیں، جب وہ انگریزوں اور مسلمانوں سے اپنا حساب چکائیں گے۔ دیوتا سروپ بھائی پرمانند نے معروف ہندو لیڈر، لالہ لاجپت رائے کو ۱۹۲۳ء میں اپنے ایک خط میں لکھا کہ مسلمانوں کو اٹک پار دھکیل دینا چاہیے۔ اس کی رائے میں اس گہرے زخم کا اندمال جو اسلام کے ظہور سے بھارت کو پہنچا تھا، ملک کی تقسیم اور آبادی کے تبادلہ ہی سے ہو سکتا تھا۔ خود لالہ لاجپت رائے کے نزدیک ہندو مسلم اتحاد نہ تو ممکن تھا اور نہ ہی قابلِ عمل۔ اس رائے کا اظہار لالہ جی نے آزاد خیال بنگالی لیڈر، سی، آر داس کو مرسلہ ایک خط میں کیا تھا۔

ہندو ہر اس سرکاری اقدام کی مخالفت پر تُل جاتا جس میں مسلمانوں کی بھلائی کا امکان ہوتا تھا۔ ۱۹۱۱ء میں بنگال کی تقسیم کی جو تنسیخ ہوئی، اس کے ذمہ دار ہندو دہشت پسند تھے۔ صوبہ بمبئی سے سندھ کی علیحدگی اور بلوچستان اور صوبہ سرحد کو صوبائی اختیارات کی تجاویز کو ہندوؤں نے بڑی لیت و لعل کے بعد بادلِ ناخواستہ ہی قبول کیا تھا۔ کٹر ہندو عوام کی نمائندہ جماعت ہندو مہاسبھا تھی جس نے اپنی مسلمان دشمنی کے اظہار میں کبھی بخل نہ کیا۔ ہندو سنگھٹن اور جن سنگھ کی تنظیمیں اسی کی کوکھ سے نکلی تھیں۔ سوامی شردھانند نے شدھی کی تحریک شروع کی جس کا مقصد مسلمانوں کو ہندو بنانا تھا۔ اس کے ردِعمل کے طور پر ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور میر غلام بھیک نیرنگ نے مسلمانوں کی دفاعی تنظیم اور تحریکِ تبلیغ کی بنیاد رکھی۔

قائداعظم نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز ایک ہندو قوم پرست کی حیثیت سے کیا تھا۔ چنانچہ مسز سروجنی نائیڈو نے انھیں "ہندو مسلم اتحاد کا سفیر" کے خطاب سے نوازا تھا۔ ایک وقت تھا کہ وہ ہندوؤں سے مفاہمت کی خاطر انتخابات میں مسلمانوں کی علیحدہ نیابت کے حق سے دست برداری پر بھی راضی ہو گئے تھے بشرطیکہ مناسب تحفظات، ہندو اکثریت کی جانب سے مسلمانوں کو مل جائیں۔ ان تحفظات کی توضیح ۱۹۲۷ء کی معروف "دہلی تجاویز" اور قائداعظم رح

کے مشہور "چودہ نکات" میں ملتی ہے۔ کانگریس نے دہلی تجاویز کو منظور کر لیا تھا لیکن جب ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ مرتب ہوئی تو مہاسبھائی عنصر کے زیر اثر کانگریس نے ان تحفظات کو خیرباد کہہ دیا۔ اس طرح سی۔ ایس رنگا آئر کے الفاظ میں "منظم فرقہ واری عصبیت نے قوم پرستی کا دم بھرنے والوں پر غلبہ حاصل کر کے ان کو ذہنی انتشار میں مبتلا کر دیا۔" قائدِ اعظم اور مولانا محمد علی جوہر نے ایک آخری کوشش کی کہ ہندو انصاف پسندی سے کام لے کر، نہرو رپورٹ میں مناسب ترمیم پر آمادہ ہو جائے، لیکن یہ کوششیں رائیگاں گئیں اور کلکتہ کی آل پارٹیز کانفرنس جو مفاہمت کی غرض سے بلائی گئی تھی، ناکام ہو گئی۔ اس واقعہ نے قائدِ اعظم کی آنکھیں کھول دیں اور انھیں با چشمِ نم کہنا پڑا کہ اب ہماری راہیں الگ الگ ہو گئی ہیں۔

اس تجربے کا اعادہ قائدِ اعظم کے لیے گول میز کانفرنس (۳۱-۱۹۳۰ء) میں "مہاتما" گاندھی اور دیگر ہندو زعما کے موقف سے ہوا۔ قائد اعظم نے اپنے تاثرات ۱۹۳۲ء میں ان الفاظ میں بیان کیے:

"میں گول میز کانفرنس کی نشستوں میں اپنی زندگی کے سخت ترین دھچکے سے دوچار ہوا۔ خطرے کے درپیش، ہندو جذباتیت، ہندو ذہنیت اور ہندو رویّہ نے مجھے اس نتیجہ پر پہنچایا کہ اتحاد ایک امید موہوم ہے اور مسلمان ایسی سرزمین میں چھوڑ دیے گئے ہیں، جس کا کوئی والی وارث نہیں۔"

لارڈ زیٹ لینڈ نے اپنے جائزے میں خیال ظاہر کیا کہ "اگر گاندھی فیصلہ کے لیے آزاد ہوتا تو وہ شاید مسلمانوں کے مطالبات تسلیم کر لیتا لیکن پنڈت مدن موہن مالویہ جو مہاسبھا کا نمائندہ تھا، اس کا شیطان ثابت ہوا۔"

۱۹۳۷ء کے انتخابات کے بعد کانگریس کو چھ سات صوبوں میں وزارتیں بنانے کا موقعہ ملا لیکن وہ اُن میں مسلم لیگ کو نمائندگی دینے کے لیے تیار نہ تھی۔ ان وزارتوں کے کردار پر ایک قوم پرست پروفیسر محمد مجیب (علیگ) کا تبصرہ خیال افروز ہے۔ انھوں نے لکھا:

"کانگریسی وزارتوں کے رویے میں ایک ناقابلِ برداشت چھچھورپن تھا۔ وہ اپنے آپ کو حکومت اور ملک دونو کے مترادف سمجھنے لگے۔ ..... اُردو راتوں رات اپنی قانونی حیثیت کھو بیٹھی اور ایک ایسی زبان نے اس کی جگہ لے لی جو موسیقیت سے عاری تھی اور جس کے اکثر الفاظ کے بارے میں یقین

نہیں ہوتا تھا کہ کسی انسانی زبان پر کبھی آئے ہوں"۔

صوبجات متوسطہ کے وزیر اعلیٰ، ڈاکٹر کھارے نے وزارت سے علیحدگی کے بعد ایک بیان میں انکشاف کیا کہ اُن کی وزارت نے صوبہ کے واحد مسلمان افسر ضلع کی مستقلی کی شدید مخالفت کی تھی۔ ناگپور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس نے اپنے ایک بے لاگ فیصلے میں لکھا کہ پولیس، کانگریسی لیڈروں، ماتحت عدلیہ اور وزرا کا گٹھ جوڑ اس کوشش میں تقریباً کامیاب ہوگیا تھا کہ بے گناہ لوگوں کو محض اس بنا پر تختۂ دار پر لٹکا دیا جائے کہ وہ مسلمان تھے۔ خود قائدِ اعظم نے ۱۹۳۸ء میں "پیر پور رپورٹ" کے حوالہ سے فرمایا: کہ "یہ ملک کی بدقسمتی بلکہ ایک المیہ ہے کہ کانگریس کے کرتا دھرتا ملک کی دوسری قومیتوں اور ثقافتوں کو کچل دینے اور ہندو راج قائم کرنے پر تُلے بیٹھے ہیں۔ وہ بات سوراج کی کرتے ہیں لیکن مقصود اُن کا ہندو راج ہے ..... ہندو ذہنیت اور ہندو تصورِ زندگی کو پروان چڑھایا جا رہا ہے اور مسلمانوں کو اپنی روزمرہ کی زندگی میں ہندو آدرش اپنانے پر مجبور کیا جا رہا ہے"۔

اب قائدِ اعظم علامہ اقبال کے پیش کردہ مسلم قومیت کے تصوّر سے پوری طرح ہم آہنگ ہو چکے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کے تاریخی اجلاسِ لاہور میں فرمایا:

"ہندوستان کا مسئلہ بین فرقائی نہیں، بین قومی ہے۔ اس بات کا اندازہ لگانا سخت مشکل ہے کہ ہمارے ہندو دوست کیوں اسلام اور ہندو دھرم کی حقیقت سمجھنے سے قاصر ہیں۔ صحیح معنوں میں یہ دو مذہب نہیں بلکہ مختلف اور متغایر سماجی نظام ہیں۔ یہ محض خام خیالی ہے کہ ہندو اور مسلمان کبھی ایک مشترکہ قومیت پیدا کر سکیں گے .... ہندوؤں اور مسلمانوں کے دینی فلسفے، اُن کے معاشرتی آداب، اور ان کا علمِ ادب ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ وہ نہ آپس میں شادیاں کرتے ہیں، نہ اکٹھے بیٹھ کر کھاتے پیتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ وہ دو مختلف تمدّنی نظاموں کے نمائندے ہیں، جن کی اساس میں متناقض افکار و تصوّرات مضمر ہیں۔ ان کا زندگی کا تصوّر اور زندگی کے بارے میں زاویۂ نظر ایک دوسرے سے مختلف ہے .... ہندو اور مسلمان مختلف تاریخی منابع سے فیضان حاصل کرتے ہیں۔ بسا اوقات ایک کا ہیرو دوسرے کا دشمن ہوتا ہے اور اسی طرح ایک کی فتوحات دوسرے کی شکستیں ہیں"۔

بعض دانشوروں کا خیال ہے کہ قائدِ اعظم پاکستان کے قیام کے بعد دو قومی نظریہ سے منحرف ہو گئے تھے۔ اس بارے میں استشہاداً اس تقریر سے کیا جاتا ہے جو آپ نے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کی پہلی نشست منعقدہ ۱۱ر اگست ۱۹۴۷ میں فرمائی تھی اور جس میں انھوں نے زوردار پیرائے میں بحیثیت پاکستانی شہری مسلمانوں اور ہندوؤں کے مساویانہ حقوق کی صراحت کی تھی۔ اس تقریر کا مفہوم غلط سمجھ لیا گیا ہے۔ اسلام دیگر مذاہب کے نام لیواؤں سے مکمل رواداری سکھاتا ہے، اگر وہ بطور امن پسند شہری، اسلامی ریاست کے ماتحت بود و باش اختیار کریں۔ اس غلط تعبیر کی تردیدِ محکم ان الفاظ سے ہوتی ہے جو قائدِ اعظم نے ڈنکن ہوپ نمائندۂ رائٹر سے ۲۵ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو ایک ملاقات میں فرمائے:

"دو قومی نظریہ دراصل نظریہ نہیں، ایک حقیقت ہے۔ ہندوستان کی تقسیم اسی حقیقت پر مبنی ہے۔ مزید برآں اس حقیقت کا حتمی ثبوت ان گھناؤنے اور افسوسناک واقعات میں ملتا ہے جو گزشتہ دو ماہ میں ظہور پذیر ہوئے اور نیز بھارتی ڈومینین کے اس اقدام میں کہ انھوں نے پاکستان سے اپنے ہندو شہریوں کو نکال لیا۔ اس کے بعد یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ یہاں ایک قوم کا وجود تھا۔ میں اس بارے میں مزید کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ اور کئی واقعات رونما ہو رہے ہیں جو اس حقیقت پر دال ہیں کہ بھارتی ڈومینین ایک ہندو ریاست ہے۔"

اس بیان میں "گھناؤنے واقعات" سے مراد مسلمانوں کا وہ بہیمانہ قتلِ عام ہے جو بھارتی علاقوں میں ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں منظرِ عام پر آیا اور جس کے نتیجے میں مسلمان مہاجرین کے لٹے پٹے قافلے پاکستان آنے پر مجبور ہوئے۔

قائدِ اعظم نے جو تقریر ۱۴ر فروری ۱۹۴۸ء کو سبّی دربار میں فرمائی، اُن کے پاکستان کے اسلامی تشخص کے بھرپور شعور کا ایک روشن رخ ہے۔ آپ نے بلوچستان کے انتظامی مستقبل کے متعلق اپنے منصوبے کے حوالے سے ارشاد فرمایا:

"اس منصوبے کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے میرا ذہن ایک بنیادی اصول کی طرف جاتا ہے اور وہ ہے اسلامی جمہوریت کا اصول۔ میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات ان سنہری قواعدِ عمل کی پیروی میں ہے جو ہمارے شارعِ اعظم، پیغمبرِ اسلام نے ہمارے لیے متعین کیے تھے۔ آیئے! ہم اپنی جمہوریت کی بنا

حقیقی اسلامی آدرشوں اور اصولوں کی اساس پر کھیں۔ باری تعالیٰ نے ہمیں تعلیم دی ہے کہ ریاستی معاملات میں ہمارے فیصلے باہمی تمحیص و مشورہ کی رہنمائی میں ہونے چاہئیں۔ میرے بلوچستانی بھائیو! میں آپ کے لیے خدا کی معاونت اور مکمل کامیابی کی آرزو رکھتا ہوں تاکہ نئے دور کا آغاز ہو سکے۔ خدا کرے آپ کا مستقبل اتنا ہی روشن ہو جتنا میری دعاؤں اور آرزوؤں کا تقاضا ہے۔ میری دعا ہے کہ آپ کو خوشحالی نصیب ہو۔ پاکستان زندہ باد"!

اگرچہ خطاب براہِ راست ہمارے بلوچی بھائیوں سے تھا لیکن وہ درحقیقت ان کی معرفت تمام پاکستان سے مخاطب تھے۔ اور یہ ان کے الفاظ پاکستان کے آئین سے متعلق اُن کی دلی توقعات کے آئینہ دار ہیں۔

سطعات

از شاہ ولی اللہ ترجمہ: سید محمد متین ہاشمی

حضرت شاہ ولی اللہؒ نہ صرف برصغیر پاک و ہند کی عظیم شخصیت تھے بلکہ اپنے دور میں عالمِ اسلام کی ایک نہایت قابلِ فخر اور بلند مرتبت ہستی تھے۔ وہ بہترین مصلح، بہت بڑے مصنف، اونچے درجے کے عالمِ دین، بے مثال مفسّر، محدّث اور فقیہ تھے۔ ان کی تصنیفات اہلِ علم کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں جن افکار و خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ ہر دور کے لیے مفید اور لائقِ عمل ہیں۔

شاہ صاحبؒ کی گراں قدر تصنیفات میں "سطعات" کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کے اردو ترجمہ کی شدید ضرورت تھی۔ چنانچہ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ یہ سعادت حاصل کر رہا ہے۔ فاضل مترجم نے حواشی کے علاوہ ایک جامع مقدمہ میں شاہ صاحبؒ اور ان کے خاندان کے حالات اور ان کی خدمات کا ذکر بھی کیا ہے۔ قیمت: گیارہ روپے

ملنے کا پتہ: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور